POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 October 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 16-10-2026 • Price: 5/- • 22-28 October 2026 • Issue: 40 • Vol:85

۲۲ تا ۲۸/ اکتوبر ۲۰۲۶ء • شمارہ:۴۰ • جلد:۸۵

تصوّف، صحافت، سیاست، مردِ حُر اور رئیس المتغزّلین

حسرتؔ موہانی

ڈاکٹر عرفان شاہ

سیّد فضل الحسن حسرتؔ موہانی (1875-1951) ہندستان کے شمالی صوبہ یوپی کے قصبہ موہان میں سیّد اظہر حسن کے گھر تولد ہوئے۔ خاندانی اعتبار سے سیّد زادے تھے۔ ان کے پردادا سیّد شاہ محمد وجیہ الدین صوفی بزرگ تھے جن کا عرس موہان میں اب بھی منعقد ہوتا ہے[1]۔

حسرتؔ نے دو عقد کیے۔ دونوں سے ایک ایک لڑکی ہوئی۔ پہلی شادی کم سنی میں طالب علمی کے دوران بیگم نشاط النساء سے ہوئی جو حسرتؔ کے عزیزوں میں تھیں۔ انھوں نے ہر موقعے پر ثابت قدمی سے حسرتؔ کا ساتھ نبھایا۔ قیدِ فرنگی سے مولانا کی جو غزل ان تک پہنچتی وہ اسے جمع کر کے مرتب کرتیں اور پھر چھپوا دیتیں۔ دیوانِ حسرتؔ کی تدوین کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ مولانا نے 1903 میں اپنا مشہور رسالہ 'اردوے معلیٰ'[2] شروع کیا۔

مولانا کے اندر ایک انقلابی بسیرا کرتا تھا۔ انھوں نے 'اردوے معلیٰ' میں انقلابی نوعیت اور حکمرانوں کے خلاف مزاحمتی صحافت کا آغاز کیا۔ 1908 میں سودیشی تحریک (صرف ہندستان میں بنا ہوا مال خریدا جائے) کی حمایت اور مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی کے خلاف مضامین چھاپنے کی پاداش میں انگریز حکومت نے 'حسرتؔ کو دو سال قیدِ بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا دی[3]۔ جیل میں انھیں کسی قسم کی سہولت حاصل نہ تھی حالاں کہ وہ شاعر، ادیب اور ایک سیاسی قیدی تھے۔ قلم کاغذ فراہم کرنے کی بجائے ان سے چکی میں گیہوں پسوایا جاتا۔ انگریز حکومت کا رویہ ان سے انتہائی ظالمانہ تھا۔

حسرتؔ تصوف کے سلسلۂ چشتیہ قادریہ سے وابستہ مولانا عبد الوہاب فرنگی محلی کے مرید تھے[4]۔ مولانا کی والدہ اور پورا خانوادہ مولانا شاہ عبدالرزاق سے بیعت تھا۔ فرنگی محل کے یہ علما اپنے علم و فضل اور تقویٰ میں لکھنؤ کے ممتاز خانوادے میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا عبدالوہاب کے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالباری انگریزوں کے سخت مخالف اور انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ حسرتؔ نے اپنے مرشد کے وصال کے بعد مولانا عبدالباری سے بیعت لینے کی اجازت مانگی تاکہ وہ لوگوں کو اپنا مرید بنا سکیں مولانا عبدالباری نے انھیں بخوشی اجازت عطا کی۔

حسرتؔ موہانی نظمِ جدید کے مبلغ اوّل مولانا محمد حسین آزاد کے چھیالیس سال بعد اور تنقیدِ جدید کے بانی اور آزادؔ کے حلیف خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے اکتالیس سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ آزادؔ اور حالیؔ نے اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے نام پر جانے یا انجانے میں 'انجمنِ پنجاب' 1865 میں قائم کر کے انگریز افسروں اور حکومت کی ایما پر غزل کے خلاف ایک زبردست محاذ بنایا۔ انھوں نے اپنی تحاریر اور تقاریر میں نظم جدید اور موضوعاتی نظموں کو اردو شاعری کی نجات کا راستہ بتایا اور غزل کو فرسودہ، ناکارہ، خیالی اور جاہلانہ صنف قرار دیتے ہوئے اسے ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس میں طرح طرح کے عیوب ڈھونڈے اور یہاں تک کہ حالیؔ نے جو پہلے خوب صورت غزل گو تھے، خود غزل کہنا چھوڑ دیا اور اپنی اُس شاعری کو 'ایام جاہلیت' کی شاعری قرار دیا۔ حالیؔ نے غزل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا:

ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت اب گائیں کیا[5]

ناقدین اس کی کھوج لگائیں کہ آزاد و حالی یا تو انگریز حکومت کے خفیہ احکامات کے تحت ایسا لکھنے اور کہنے پر مجبور تھے یا وہ خود بھی نظریاتی طور پر انگریزوں سے مصالحت کرنے اور ان کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو تباہ کرنے کے قائل تھے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ غزل اپنی ہیئت میں علامت سازی کے پیرایے میں وہ سب کچھ ظلم و جبر کے خلاف حق و صداقت کے ساتھ کہنے کی صلاحیت رکھتی تھی، جس پر قانون بھی گرفت کرنے سے قاصر تھا۔ موضوع حسرتؔ کی غزل ہے، اس لیے اس بحث کو یہیں روکتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

مولانا حسرتؔ موہانی ایک قوم پرست سیاست داں، اردو غزل کے اسرار و رموز کے راز داں اور شاید فرنگی سرکار کی طرف سے غزل کی مخالفت کے اصل مقصد سے واقف تھے۔ انھوں نے بے باکی کے ساتھ اپنے سیاسی، مذہبی اور ملی جذبات و افکار کو فطری اور روایتی انداز میں خوف زدہ انگریز کے سامنے غزل میں پیش کر کے مخالفینِ غزل کو منہ توڑ جواب دیا، جس سے غزل کا شعر روشنی کی کرن بن کر چہار سو اُجالے کا نقیب بنا۔ حسرتؔ نے غزل کے تنوع، صفاتِ جمال اور امکانات کی وسعت سے معاشرے کو از سرِ نو روشناس کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ کو غزل کی نشاۃ الثانیہ کا بانی اور رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے۔

حسرتؔ قدیم و جدید روایت اور رویے سے پوری طرح آشنا اور دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے تمام پہلوؤں سے کما حقہ باخبر تھے، ملاحظہ کیجیے:

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا[6]

گویا لکھنؤ اور دہلی کے مکتبوں کی زبان نے جب نیا آہنگ اختیار کیا تو وہ حسرتؔ کی زبان بن کر آبروے غزل کی امین اور جدید غزل کی لغت بنی۔ ممتاز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی یوں اعترافِ عظمت کرتے ہیں:

'حسرتؔ نے غزل کی آبرو اس زمانے میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغے میں تھی۔ انھوں نے غزل کی اہمیت و عظمت ایک نامعلوم مدت تک منوالی۔'[7]

حسرتؔ پر ایک الزام یہ ہے کہ ان کا اپنا اسلوب نہیں بلکہ یہ دیگر سے متاثر ہو کر ان کی زمینوں اور طرز میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حسرتؔ وسعتِ نظری و قلبی کے پیروکار تھے۔ انھوں نے اساتذۂ متقدین یا جس شاعر کا کلام اچھا پایا اس کا اعتراف کھلے دل سے کیا۔ اس کو چربہ سازی یا سرقہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ محبت کا اظہار سمجھنا چاہیے مثلاً:

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا[8]

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض[9]

ان اشعار سے یہ خیال قائم کر لینا کہ حسرتؔ کا اپنا کوئی رنگِ سخن نہیں، درست نہیں۔ اس بارے میں معروف نقاد ڈاکٹر یوسف حسین رقم طراز ہیں:

'یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کا شعری اسلوب تمام تر دوسروں سے مستعار ہے۔ ان کا اپنا رنگ ہے اور اس رنگ میں بڑی گہری انفرادیت ہے۔'[10]

فنی اعتبار سے حسرتؔ کی غزل میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کی آمیزش واضح ہے، لیکن اس سے جو حسن ان کے کلام میں پیدا ہوا وہی ان کا اصل رنگِ سخن ہے، سادہ اور صاف فوراً اپنی طرف کھینچ لینے والا:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں[11]

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

قسط:2

شبلی کی تحریکی حسیت اور اس کے اسباب و محرکات

محمد الیاس الاعظمی

(گذشتہ سے پیوستہ)

۶۔ تحریک انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو کی تحریک دراصل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک تھی بلکہ اس کا ایک خاص پس منظر تھا، البتہ اس کے بانی سکریٹری علامہ شبلی نعمانی قرار پائے، چناں چہ انھوں نے اس کے لیے بہت تگ ودو کی اور اس کے قیام واستحکام، ترقی اور بقا کے لیے متعدد علمی وتنظیمی منصوبے بنائے اور انتہائی محنت ولگن اور اپنی جدوجہد سے اسے ایک کامیاب ادارہ اور تحریک کی شکل دی، اس کے ذریعے متعدد علمی کتابیں تصنیف وترجمہ ہوکر نہ صرف شائع ہوئیں بلکہ ان سے ہمارے ادبی ذخیرے میں گراں مایہ اضافہ ہوا، انجمن سے مصنّفین ومترجمین اردو کو انعامات دیے گئے، راقم نے انجمن ترقی اردو کی عہد شبلی کی تاریخ اور ان کے کارنامے 'علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو' کے نام سے قلم بند کی ہے، جسے کتابی صورت میں مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا نے شائع کیا ہے۔ اس کا اضافہ شدہ اڈیشن انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے شائع کیا ہے، چوں کہ یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ذیلی تحریک تھی، اصل تحریک کانفرنس تھی، اس لیے ناچیز نے 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ' کے عنوان سے بھی اس تحریک بلکہ دونوں تحریکوں میں شبلی کا حصہ اور ان کی نہایت عظیم الشان خدمات کی تفصیلات سپردِ قلم کی ہیں اور بلاشبہ یہ علامہ شبلی کی کتاب زندگی کے بڑے اہم اور تاریخ ساز کارنامے ہیں۔

۷۔ تحریک ندوہ میں شمولیت اور خدمات

ہندستان میں مسلمانوں نے تعلیمی اغراض ومقاصد کے تحت جو تحریکیں قائم کیں، ان میں دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے بعد تحریک ندوۃ العلماء کا نام آتا ہے۔ اس کا آغاز انیسویں صدی کے آخری دہائی میں مولانا محمد علی مونگیری (1927-1846) اور ان کے رفقاے کار نے کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد قدیم وجدید تعلیم میں باہم اشتراک سے دونوں کے درمیان جو خلا تھا اس کو پاٹنا تھا، نیز نئے علمی معاشرے اور نئے نظام تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم نہایت اخلاص سے اس کام کو لے کر آگے بڑھے، یہ ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھا، اس کے متعدد سالانہ جلسے منعقد ہوئے اور مقاصد کے حصول اور اس کے طریق کار پر غور وخوض ہوا اور اس کا ایک لائحۂ عمل طے پایا مگر مولانا مرحوم کے بیشتر رفقاے تحریک ندوے میں علامہ شبلی کے سوا سب قدیم نظامِ تعلیم کے پروردہ تھے اور وہ چاہ کے بھی اس خول سے باہر نہ آسکے، لیکن علامہ شبلی چوں کہ عرصے تک ایم اے او کالج علی گڑھ میں استاذ رہ چکے تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی خدمت کر چکے تھے، اس لیے مقاصد ندوہ پر ان کی زیادہ گہری نظر تھی، وہ اول روز سے اس تحریک میں شامل رہے۔ وہی مخالفین تحریک ندوہ اور کم نظروں کے جوابات دیتے اور اس کی اہمیت و افادیت کو بھی واضح کرتے، اس کے سالانہ اجلاسوں میں ندوہ کی ضرورت واہمیت پر تقریریں کرتے اور تحریک ندوہ پر مستقل تحریریں اور تقریریں پیش کرتے رہے، اس کی تفصیل کے لیے ندوۃ العلماء کی سالانہ رودادیں اور ناچیز کی مرتبہ کتاب 'کلیات خطباتِ شبلی' مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

تحریک ندوہ میں یہ طے پایا کہ اس کا ایک دستور ہونا چاہیے، چناں چہ علامہ شبلی نے بزرگوں کے مشورے سے اس کا دستور بنایا۔ پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ ہوا تو علامہ شبلی نے اس کا بھی نصاب تعلیم تیار کیا، مالی حالات بہتر کیے، نواب حیدرآباد، نواب ریاست بھوپال اور نواب بہاول پور سے خط وکتابت کرکے ایک بڑی رقم (پچاس ہزار روپے) حاصل کی، ان دلچسپیوں کی بنا پر انھیں معتمد تعلیم منتخب کیا گیا، ان کو لے کر اراکین ندوہ میں اختلافات رہے۔ علامہ شبلی نے اسے بھی حل کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے، پھر خود علامہ شبلی کی شدید مخالفت ہوئی اور طرح طرح کے بے بنیاد الزامات ان پر عائد کیے گئے، چناں چہ علامہ شبلی بالآخر روز روز کے تماشوں سے تنگ آکر ندوہ سے مستعفی ہوگئے اور وطن آکر دارالمصنّفین کی بنیاد ڈالی۔

تحریکِ ندوہ کے منصوبے میں ایک علمی رسالے کی اشاعت بھی شامل تھی، چناں چہ ندوہ کے انتظامیہ نے بڑی مشکل سے اس کی اجازت دی اور علامہ شبلی کے ساتھ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو بھی مدیر بنایا، ماہنامہ 'الندوہ' لکھنو سے جولائی 1904 میں نکلا اور بہت شان سے نکلا اور بہت جلد علمی حلقوں میں قبولیتِ عام حاصل کرگیا۔ اس نے علما کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ اہلِ علم کو بھی بہت متاثر کیا، اس کی ادارت میں علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ ومنتسبین مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے حصہ لیا اور اس کی اہمیت وعظمت میں اپنی بلند پایہ علمی وتحقیقی تحریروں سے گراں قدر اضافہ کیا، اور ایک علمی ذوق کی آبیاری کی۔

علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کی نہ صرف ادارت کی بلکہ اس سے اور بھی متعدد کام لیے، ان میں سب سے نمایاں کام اپنے تلامذہ کی تصنیفی تربیت ہے، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ نے اسی الندوہ سے علمی مقالات لکھنے کا آغاز کیا اور نامور ادیب وانشاپرداز بن کر نکلے پھر تاحیات علم و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے اور متعدد علمی وتحقیقی کتابیں سپردِ قلم کیں، جو آج ہمارے علمی سرمایے کی زینت ہیں۔

اہلِ ندوہ یا ندوے پر جو لوگ قابض ہونا چاہتے تھے، وہ علامہ شبلی کے ہر کام میں رخنہ ڈالتے، اس سے عاجز آکر مئی 1912 میں 'الندوہ' کی ادارت سے مستعفی ہوگئے۔ اس کے بعد الندوہ سال دو سال اور نکلا، پھر بند ہوگیا۔ کئی برس بعد مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اسے دوبارہ جاری کیا مگر وہ بھی دو سال یا کچھ اور دنوں تک نکل کر ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

ماہنامہ 'الندوہ' نے اس مختصر مدت میں بھی ایک علمی تاریخ رقم کردی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ استفادہ کیا جاتا رہا۔ اس کا ہر شمارہ اس قدر علمی مواد ومعلومات سے پر ہوتا تھا کہ آج کے جدید دور میں تمام تر سہولتوں کے باوجود کوئی رسالہ اس کا مدِمقابل نہیں ہوسکتا۔

علامہ شبلی نے جس وقت ندوہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا ان کے احباب بالخصوص نواب محسن الملک نے انھیں روکا تھا اور اس سے ہونے والے نقصان کے خدشات کا ذکر کیا مگر علامہ شبلی نے ندوہ کی محبت میں کسی کی ایک نہ سنی، لیکن بالآخر وہ خدشات وقوع پذیر ہوکر رہے اور انھیں ندوہ چھوڑنا پڑا۔

چوں کہ علامہ شبلی متعدد تحریکوں سے وابستہ رہے اور خود بھی کئی تحریکیں چلائیں، اس لیے اہلِ قلم نے ان کا ذکر مختلف تحریکوں کے ضمن میں کیا ہے، خاص طور سے تحریک علی گڑھ اور تحریک ندوۃ العلماء کے تعلق کا بہت سے اہلِ قلم نے موازنہ ومقابلہ کیا ہے۔ 'موجِ کوثر' میں شیخ محمد اکرام نے جو تجزیہ کیا ہے وہ واضح طور پر یک طرفہ اور مخالفانہ ہے، اس لیے ان سے قطع نظر ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' کے تجزیے کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علی گڑھ تحریک کے جس فکری زاویے کو سرسیّد نے ابھارا تھا شبلی نے اسے مستحکم کرنے کی کوشش کی، شبلی ادیب اور شاعر ہی نہ تھے، عالم اور مفکر بھی تھے۔ (اردو ادب 1957 تا 1966، ص 38) اور شبلی علی گڑھ تحریک اور سرسیّد سے ہی روشنی حاصل نہیں کرتے بلکہ وہ خود بھی روشنی کا مینار تھے، چناں چہ ان کی یہ شخصی انفرادیت علی گڑھ تحریک کے لیے ایک اضافی قوت کا سرچشمہ تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اس تحریک کی جامع الصفات شخصیتوں میں شمار ہوئے، وہ محقق، نقاد، ادیب، شاعر، خطیب، فلسفی اور متکلم تھے، چناں چہ انھوں نے ہر موضوع پر پوری ذمے داری سے قلم اٹھایا اور علمی، ادبی اور مذہبی مباحث کو اپنے منفرد دلائل اور آزاد تفکر سے سلجھا دیا۔ شبلی نے اپنی انفرادی فکر سے ایک جدید علم کلام کی بنیاد رکھی اور اس موضوع پر علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم وغیرہ کتابیں تصنیف کیں، ان کتابوں میں اگرچہ شبلی کے ذاتی فکر کا پرتو موجود ہے، تاہم یہ علی گڑھ کی روح سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ شبلی نے ان کتابوں میں مذہبی امور کو سمجھنے کے لیے عقلی نقطہ نظر استعمال کیا ہے اور اختلاف مذاہب کے سیاسی اسباب تلاش کیے ہیں۔''

(اردو ادب کی تحریکیں، ص 346)

ڈاکٹر انور سدید کا یہ بھی خیال ہے:

''سرسیّد اور شبلی ایک ہی منزل تک پہنچنے کے آرزومند تھے، لیکن ان دونوں کے طرزِ عمل میں فرق تھا، سرسیّد آگے بڑھنے کے لیے ماضی سے روشنی حاصل کرنے کے حق میں تھے، شبلی گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑانے اور دورِ عظمت کی تجدید کے خواہاں تھے، چناں چہ ندوۃ العلماء شبلی کے اس خواب کی تعبیر تھا، علی گڑھ اور ندوہ میں جہت کا اختلاف تو نظر آتا ہے، لیکن دونوں میں مقصد کا اختلاف موجود نہیں، اور دونوں کی قدرِ مشترک شبلی نعمانی ہیں، بدقسمتی سے ان دو ادواروں میں اشتراکِ عمل پیدا نہ ہوسکا اور بقولِ شبلی 'ندوہ مولویوں میں پھنس گیا اور اس کا علمی معیار روز بہ روز رو بہ تنزل ہوتا چلا گیا'۔ شبلی کی انفرادی خوبیوں اور ادبی کمالات سے انکار ممکن نہیں تاہم ان کی انفرادیت کو تخلیقی جہت علی گڑھ تحریک نے عطا کی اور بقول خلیل الرحمٰن اعظمی شبلی کو علی گڑھ کی فضا نصیب نہ ہوتی تو ان کی جگہ مولانا فاروق چریاکوٹی اور فیض الحسن سہارن پوری کی صف میں ہوتی اور اردو زبان شعرالعجم، سیرۃ النبیؐ اور الفاروق جیسے کارناموں سے محروم رہ جاتی۔' (علی گڑھ تحریک ص: 315)

اس تجزیے کے بعد ڈاکٹر انور سدید نے مولانا سیّد سلیمان ندوی کے شبلی و سرسیّد کے درمیان اختلافات کا جائزہ لیا ہے اور سیّد سلیمان ندوی کے بیانات کی تردید کی ہے، مذہبی اختلافات کے ساتھ سیاسی اختلاف کی بھی تردید کی ہے، حالاں کہ سیاسی اختلاف کا ذکر خود علامہ شبلی نے کیا ہے، اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شبلی کا اختلاف درحقیقت ایڈی پس کمپلیکس کا شاخسانہ تھا۔ (اردو ادب کی تحریکیں، ص: 355)

آخر میں ڈاکٹر انور سدید نے تحریک انجمن پنجاب کے اثرات کے ضمن میں حالی، اکبر اور شبلی کی نظم نگاری کا تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے:

'حالی کی سنجیدگی اور اکبر کے مزاح کا امتزاج لطیف شبلی کی نظم نگاری کی صورت میں سامنے آیا، ان کے ہاں صورت واقعہ پر گہری نظر ڈالنے اور محرک واقعہ پر طنز کا نشتر چلانے کا رجحان نمایاں ہے، اردو نظم کی زیر بحث تحریک میں شبلی کی عطایہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوعات داخلی آنچ سے پگھلانے کی سعی کی اور جذبے کی وہ لہر جو حالی اور آزاد کی شاعری میں نسبتاً مدھم ہے، شبلی کی شاعری میں تیز نظر آتی ہے۔'

(اردو ادب کی تحریکیں، ص:403)

مگر ڈاکٹر انور سدید نے علامہ شبلی کی ان سیاسی، تاریخی اور اخلاقی نظموں اور ان کے اثرات و محرکات کا ذکر سرے سے نہیں کیا، جن کے متعلق مولانا سیّد سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''اس (چوتھے) دور میں سیاسی نظموں کے علاوہ مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے شروع کیے، جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلے میں بھاری ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں اور نہ اب تک ان کی تقلید کی جاسکی۔'' (کلیات شبلی اردو، ص:23)

۸۔ تحریکِ تصحیحِ اغلاط

علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ سے پہلے شاعر و ادیب، مناظر اور عالم دین تھے، علی گڑھ پہنچے تو انھیں اسلام اور مسلمان دشمنوں کا صحیح علم ہوا، چناں چہ انھوں نے اس کے تدارک کے لیے اور بہت سے علمی و تحقیقی منصوبوں کے ساتھ تاریخی اغلاط کی تصحیح کے لیے کمر ہمت کس کے باندھی اور نہایت اہم تحقیقی و تنقیدی اور تاریخی مقالات لکھے، ان میں کتب خانہ اسکندریہ، الجزیہ اور حقوق الذمیین وغیرہ نہایت مشہور و مقبول ہوئے اور ان کا شہرہ دور دور تک پہنچا اور بقول مولانا سیّد سلیمان ندوی ان مضامین نے تحقیق کی دنیا میں ایک ہلچل ڈال دی۔ انھی تاریخی مقالات سے متاثر ہو کر سرسیّد کو خیال آیا:

''یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، ان کے جواب کے لیے ایک مجلس بنائی جائے، چناں چہ 1892 کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسیّد نے اس کا اعلان کیا اور مولانا (شبلی) مرحوم کے یہ مضامین اس سلسلے میں داخل کیے گئے اور مولانا (شبلی) کو اس کا سکریٹری بنایا گیا، ان کے ان مضامین کے ترجمے انگریزی اور عربی میں شائع کیے گئے۔ عربی میں خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے رسالہ 'الجزیہ' کا ترجمہ کیا، اسی سلسلے کا لکھا ہوا مشہور مقالہ 'حقوق الذمیین' ہے۔'

(حیات شبلی ص 206)

علامہ شبلی جب ندوہ آگئے تب بھی انھوں نے تاریخی کتابوں کی تصحیح کا کام جاری رکھا، خود بھی اس موضوع پر متعدد مقالات لکھے جو مقالات شبلی کے مختلف حصوں میں شامل ہیں اور اپنے تلامذہ کو بھی اس پر مامور کیا، بالخصوص مولانا سیّد سلیمان ندوی کو اس کام کی ہدایت کی اور انھیں اس صیغے کا سکریٹری نامزد کیا، چناں چہ انھوں نے نہایت تندہی سے اس کام کو انجام دیا، اس کی تفصیلات ماہنامہ الندوہ اور 'مقالات سلیمان' کے صفحات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

۹۔ تحریکِ اشاعتِ اسلام

ہندستان میں ارتداد کا فتنہ 1908 میں تیزی سے اٹھا۔ آریہ جس کی تیاری برسوں سے کر رہے تھے، صوبہ متحدہ اور میوات وغیرہ جہاں کبھی کثرت سے راجپوتوں نے اسلام قبول کیا تھا، آریوں کی جھوٹی تبلیغ اور جعل و فریب سے دوبارہ ہندو ہونے لگے، چناں چہ مسلمانوں نے اس کے تدارک کے لیے جو کوششیں کیں وہ محض انجمنوں کے قیام اور واعظوں کے وعظ و تقریر تک محدود رہیں اور وہ بھی شہروں تک، دیہاتوں میں اس کا کوئی نظم نہیں ہوسکا یا مسلمان اس جانب توجہ نہیں دے سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کے گاؤں دوبارہ ہندو ہونے لگے اور بہت سے گاؤں ہندو ہونے کو تیار بیٹھے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی حمیت اسلامی کے ایسے جذبات سے معمور تھے کہ وہ ان واقعات کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے اور جب اس طرح کے واقعات سنتے تو نہایت بے چین ہو جاتے تھے۔ چناں چہ جب انھیں شاہ جہاں پور اور بریلی وغیرہ کے واقعات کی خبر لگی تو وہ تڑپ اٹھے، وہاں جانے کی ضد کی اور کہا کہ پالکی لاؤ اور اس میں مجھے لے چلو، لیکن کچھ بھی نہیں ہوسکا۔

اس فتنے کے تدارک کے لیے انھوں نے ندوہ میں نہایت جوشیلی تقریریں کیں اور ندوہ کے پلیٹ فارم سے ایک تنظیم 'حفاظت و اشاعت اسلام' کی بنیاد ڈالی، اولاً اسے مولانا عبدالحق حقانی کی تنظیم 'ہدایت الاسلام' کے ذریعے انجام دینا چاہا، لیکن جب اس سے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تو خود اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور تقریباً دو برس تک یہ کام انجام دیتے رہے۔ یہ کام بھی ان کی عملی زندگی کا ایک اہم کارنامہ ہے، مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اس کی پوری تفصیل 'حیات شبلی' میں لکھی ہے، ہم یہاں علامہ شبلی نے اشاعت اسلام کے لیے جن امور کو ضروری قرار دیا تھا، اس کا اختصار پیش کرتے ہیں۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے:

''اشاعت اسلام کے لفظ سے اگر چہ غیر مذہب والوں کا اسلام لانا متبادر ہوتا ہے، لیکن اس وقت ہماری مراد اس سے حفاظت اسلام ہے، یعنی مسلمانوں کو اسلام اور احکام اسلام پر قائم رکھنا، یہ ظاہر ہے کہ ہزاروں لاکھوں مسلمان جو دیہات میں رہتے ہیں، احکام اسلام سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے آریہ وغیرہ ان کو مرتد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نئی نسلیں جو بچپن ہی سے انگریزی تعلیم میں مصروف ہو جاتی ہیں، وہ بھی اکثر اسلام سے ناواقف ہوتی ہیں، اس لیے انگریزی تعلیم ان کے عقائد کو متزلزل کر دیتی ہے، انھی دونوں گروہوں کے اسلام کی حفاظت کرنا اشاعت اسلام کا اصلی کام ہے، اس کی تدبیریں حسبِ ذیل ہیں:

۱- ہر ضلع میں ایک یا دو مولوی مقرر کیے جائیں جو دیہات میں جا کر اور دس دس پانچ پانچ (جیسی ضرورت ہو) روز قیام کر کے اسلام کے عقائد اور احکام سکھائیں اور ممکن ہو تو مکتب قائم کرائیں۔

۲- ہر شہر میں ایک عالم مقرر کیا جائے جو انگریزی خواں طلبہ کو ہفتے میں ایک دن دینیات پڑھائے، جس کا یا تو یہ طریقہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں اس کا انتظام کرایا جائے یا خود اس عالم کے مکان پر طلبہ جمع ہوں اور طلبہ کے مربیوں سے اس انتظام میں مدد لی جائے۔ اس انتظام کے لیے ضرور ہوگا کہ ان طلبہ کی حالت کے موافق دینیات کا نصاب تعلیم تیار کیا جائے۔

۳- ایک جماعت آریوں سے مناظرہ اور مباحثہ کرنے کے لیے تیار کی جائے جو بھاشا اور سنسکرت سے واقف ہو۔

۴- آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے جائیں، جو بخلاف موجودہ رسالوں کے نہایت تہذیب اور متانت کے ساتھ لکھے گئے ہوں۔

۵- اشاعت اسلام کی شاخیں ہر ضلع میں قائم کی جائیں، نہایت کثرت سے لوگ ممبر بنائے جائیں، چندۂ ممبری کی تعداد 2 روپے سالانہ ہو اور بذریعہ ویلو پی ایبل کے وصول کیا جائے۔

۶- اشاعت اسلام کا سکریٹری اور اس کے سفرا اور واعظین اور مقامی شاخوں کے عہدے دار سب کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ نذر و نیاز لینے کا طریقہ نہ رکھتے ہوں، ورنہ ان کے ذریعے سے فراہمی چندہ وغیرہ میں یکسو کارروائی نہ ہو سکے گی۔

۷- اس مختصر طریقِ کارروائی کو مع تمہید کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع کیا جائے اور کارروائی شروع کر دی جائے۔''

(مقالات شبلی جلد ہشتم، ص:12-13)

اشاعت و حفاظتِ اسلام کے لیے علامہ شبلی نے جن امور اور پہلوؤں کو ضروری قرار دیا ہے، بلاشبہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اشاعت اسلام یا کم از کم حفاظت اسلام کا عظیم الشان کام انجام دیا جاسکتا تھا اور یہ اصول و ضوابط آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

علامہ شبلی یہ بھی چاہتے تھے کہ اس تنظیم کو ایک پلیٹ فارم بنا کر ملک کی تمام انجمنیں مشترکہ طور پر اشاعت اسلام کا کام انجام دیں مگر افسوس کہ ملت میں اتحاد اور یکجائی کی صورت کبھی بن نہیں پاتی اور انجام کار ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس تنظیم کا بھی یہی حشر ہوا، علامہ شبلی نے عرصے تک اس کام کو تن تنہا انجام دیا اور جو کچھ بن پڑا اسے پورا کیا۔

علامہ شبلی نے اشاعتِ اسلام کے لیے جن اصولوں کی نشاندہی 1908 میں کی تھی، اگر ان کو بہ غور دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک کی تین بڑی جماعتیں جمعیۃ علماے ہند، جماعت اسلامی ہند اور تبلیغی جماعت، سب نے اپنے اصول و ضوابط میں ان سے فیض اٹھایا ہے۔

۱۰۔ تحریکِ انگریزی ترجمۂ قرآن

۱۔ انگریزی قرآن مجید کا ترجمہ اور ندوۃ العلماء (مسلم گزٹ لکھنؤ، ۵/فروری ۱۹۱۲ء)

عہدِ شبلی میں انگریزی کا کوئی مستند ترجمہ قرآن مسلمانوں کے پاس موجود نہیں تھا، اس لیے اس کی سخت ضرورت تھی، چناں چہ علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں انگریزی ترجمۂ قرآن کے لیے ایک قرارداد پیش کی جو منظور ہوئی۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ درحقیقت ایک نہایت ضروری کام ہے۔ یورپ کی زبانوں میں قرآن مجید کے کثرت سے ترجمے موجود ہیں اور جدید تعلیم یافتہ انھی کو پڑھتے ہیں، ان ترجموں میں سخت غلطیاں ہیں، اس کے علاوہ مترجموں نے اکثر جگہ حاشیہ میں اپنی طرف سے جو کچھ لکھا ہے اس میں علانیہ قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں، مثلاً جہاں قرآن مجید میں یہ ذکر ہے کہ یہودی حضرت عزیر کو خدا کہتے تھے۔ اس جگہ حاشیے میں لکھا ہے کہ ''یہودیوں پر ایک افسوس ناک تہمت۔''

ندوۃ العلماء میں یہ قرارداد منظور ہوئی تو علامہ شبلی نے ترجمے کے لیے نواب عمادالملک سیّد حسین بلگرامی (1842-1926) کا انتخاب کیا۔ علامہ شبلی کے نام ان کے 18 اپریل 1910 کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ''ان شاء اللہ زندگی باقی ہے تو دو سال کے اندر ختم [پورا] ہو جائے گا'۔ 'سورہ بقرہ' تمام اور 'آل عمران' کا معتد بہ حصہ ختم ہو چکا ہے۔''

نواب عمادالملک سیّد حسین بلگرامی ریاست حیدرآباد کے بڑے عہدے دار اور انگریزی کے ادیب و انشا پرداز تھے، وہ نہایت حزم و احتیاط سے ترجمے کا کام انجام دے رہے تھے اور تقریباً 9 پاروں کا ترجمہ اُس وقت تک ہو چکا تھا اور 5 پاروں کا ترجمہ چھپ بھی چکا تھا، علامہ شبلی چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے، چناں چہ انھوں نے نواب عمادالملک سے عرض کیا کہ آپ کی خدمت میں ایک معاون یہاں سے بھیج دیا جائے تو آپ کو سہولت ہوگی، اس کے اخراجات ندوہ سے ادا کیے جائیں گے مگر وہ اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ماموں زاد بھائی اور نامور مفسرِ قرآن مولانا حمیدالدین فراہی (1863-1930) سے جو عربی و انگریزی دونوں کے فاضل تھے، درخواست کی کہ وہ ترجمے کو ایک نظر دیکھ لیں، چناں چہ انھوں نے دیکھنا منظور کیا اور پھر اس پر ایک یادداشت لکھ کر بھیجی۔ دو برس اور یہ کام اسی طرح چلتا رہا۔ یہاں تک کہ پندرہ یا سولہ پارے کا ترجمہ ہو چکا تھا کہ 18 نومبر 1914 کو علامہ شبلی نے وفات پائی اور ان کے اور بہت سے عزائم کی طرح یہ خواب بھی خواب ہی رہ گیا۔ جس قدر ترجمہ ہو گیا تھا وہ بھی طبع نہیں ہو سکا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

طلبہ صحافت میں دلچسپی لے کر اپنا مستقبل سنواریں

سرکاری فرسٹ گریڈ کالج میں 'اردو صحافت' پر ورکشاپ سے شرکا کا خطاب

وجے پور (یکم اکتوبر)۔ طلبہ کو چاہیے کہ صحافت میں بھی دلچسپی لے کر اپنا مستقبل سنواریں۔ آج یہاں سرکاری فرسٹ گریڈ کالج نو باغ میں 'اردو صحافت' پر ایک ورکشاپ کا افتتاح کرنے کے بعد سینئر صحافی و سنڈیکیٹ رکن رانی چنما یونیورسٹی رفیع بھنڈاری اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جملہ پیشہ ورانہ کورسز کے علاوہ صحافت جو چاہے پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا میں دلچسپی رکھنے والے نوجوان اس میدان کو بھی اپنا سکتے ہیں جس کے لیے کوالیفائیڈ ہونے کے علاوہ خداداد صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان اگر آگے بڑھتے ہیں تو ایک بہترین سماج کی تشکیل ممکن ہے۔ بھنڈاری نے اس موقعے پر واضح طور پر بتایا کہ اردو صحافت میں بھی بے شمار مواقع میسر ہیں تاہم ذوق و شوق کی ضرورت ہے، حالاں کہ اس پیشے سے جڑنے کے لیے اکثر لوگ کتراتے ہیں مگر صرف آئی ڈی کی خاطر خواہش مند ہوتے ہیں جب کہ یہ عمل خطرناک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو والے صحافت میں آگے قدم بڑھاتے ہیں تو اقدار پر مبنی صحافت ضرور رنگ لاسکتی ہے۔ انھوں نے ادارہ ہذا میں اردو بطور بیسک سبجیکٹ شروع کیے جانے پر پرنسپل صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ آپشنل بھی اردو شروع کریں کیوں کہ یہاں بیسک اردو سبجیکٹ لینے والے طلبہ و طالبات کی تعداد اطمینان بخش ہے۔ بھنڈاری نے اس کالج میں اردو شعبے کو پروان چڑھانے کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ یہاں کے طلبہ جو اردو میں زیادہ مارکس حاصل کرتے ہیں، گولڈ میڈل کی گنجائش کی جائے گی جس کے لیے یہاں اردو مخیّر حضرات آگے آنے کے لیے تیار ہیں۔ صدرِ جلسہ و پرنسپل ڈاکٹر جے آنند آنور نے اپنے خطاب میں بتایا کہ محنت اور لگن ضرور رنگ لاتی ہے۔ کسی بھی پیشے میں اگر ہم دلچسپی لیتے ہیں تو کامیابی یقینی ہے جس میں صحافت کا پیشہ قابلِ ستائش ہے۔ اسٹیج پر پروفیسر سنیل پتی، ڈاکٹر جاگیردار، ڈاکٹر وشالاکشی ہونکٹی، پروفیسر شبیر مجاور، ڈاکٹر قدوس پٹیل موجود تھے۔ طلبہ تحسین ہادی منی کی تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔ رومانہ جاگیردار نے خیرمقدم کیا۔ آخر میں صفیہ روزندار نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (سالار۔ بنگلور)

حافظ کرناٹکی کے اعزاز میں

نشست وادبِ اطفال کی کتاب کا اجرا

نئی دہلی (2 اکتوبر)۔ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ادیب حافظ کرناٹکی کے اعزاز میں فصیل بند شہر کے تاریخی ادبی مرکز شاہ ولی اللہ لائبریری میں نشست منعقد ہوئی اور ڈاکٹر حبیب سیفی کی ادبِ اطفال پر مبنی تازہ تالیف کی رسمِ رونمائی عمل میں آئی۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر حافظ کرناٹکی نے کہا کہ آج میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ ایک تاریخی عظیم ادبی مرکز شاہ ولی اللہ لائبریری میں آنے کا موقع ملا، اس کے لیے میں آپ سب ذمے داران کا شکرگزار ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر حبیب سیفی کی اٹھارہویں تالیف 'اکیسویں صدی میں دہلی میں اردو ادبِ اطفال کا ارتقا' کی رسمِ رونمائی حافظ کرناٹکی و دیگر مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

ہر گھر میں کم از کم ایک اخبار باقاعدہ خریداری اور مطالعے کو معمول بنانے کی ضرورت

اردو زبان و صحافت کی بقا کے لیے اہلِ اردو کا عملی تعاون ناگزیر

بارہ بنکی (13 اکتوبر) آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی کے سکریٹری نشر و اشاعت ابوشحمہ انصاری نے ایک پریس بیان میں اخبارات کی موجودہ صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اہلِ اردو سے اپیل کی ہے کہ ہر گھر میں کم از کم ایک اخبار کی باقاعدہ خریداری اور مطالعے کو معمول بنائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صحافت کی بقا اور استحکام میں قارئین کا عملی تعاون بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ زبان پڑھنے اور سمجھنے والوں کی بڑی تعداد کے باوجود کسی اخبار کی اشاعت ایک لاکھ تک نہ پہنچ پانا ایک سنجیدہ معاملہ ہے، جس پر اہلِ زبان اور صحافت سے وابستہ افراد کو غور کرنا چاہیے۔ موجودہ دور میں صحافت کے انداز اور ذرائع تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ نئی نسل کی دلچسپیوں، بدلتے تقاضوں اور عوامی مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اخبارات کو بھی مواد اور پیشکش میں ضروری تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ مقامی خبریں، عوامی مسائل، تحقیقی رپورٹیں، مفید معلومات اور سنجیدہ تجزیے قارئین کو اخبار سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ صحافت کو درپیش مالی اور اشاعتی مشکلات بھی تشویش کا باعث ہیں۔ متعدد اخبارات اپنی اشاعت بند کر چکے ہیں جب کہ بعض ایسے اخبارات جو کبھی بارہ صفحات پر شائع ہوتے تھے، اب آٹھ صفحات تک محدود ہو گئے ہیں۔

نئی نسل کو مطالعے اور صحافت سے جوڑنے میں گھر اور تعلیمی اداروں دونوں کی ذمے داری اہم ہے۔ والدین بچوں میں مطالعے کی عادت پیدا کریں اور اساتذہ اخبارات کے ذریعے طلبہ کو زبان، سماج اور حالاتِ حاضرہ سے واقف کرائیں۔ ہندستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات نے بھی اپنے قارئین کی بدلتی ضروریت کو سمجھتے ہوئے صحافت کے نئے انداز اختیار کیے ہیں۔ تعلیمی ادارے مطالعے اور تنقیدی فکر کو فروغ دیں، ادبی و سماجی تنظیمیں مقامی سطح پر مطالعے کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائیں اور اہلِ قلم نوجوانوں میں صحافت اور زبان کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہر خاندان کم از کم ایک اخبار باقاعدگی سے خریدے اور پڑھے۔ بچوں اور نوجوانوں کو بھی اس مطالعے میں شریک کیا جائے اور دوستوں، رشتے داروں اور پڑوسیوں کو اخبار خریدنے کی ترغیب دی جائے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اخبارات کو صرف پسند کرنے کے بجائے انھیں خرید کر پڑھ کر دوسروں تک پہنچا کر زندہ رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا جائے۔ یہ پریس بیان آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی کے شعبۂ نشر و اشاعت کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ریاست میں اردو اساتذہ کی تعداد 512 ہوگئی

پہلے مرحلے میں مزید منظوری کے بعد تقرر کے عمل میں اہم پیش رفت

بنگلورو (5 اکتوبر)۔ کرناٹک میں اردو اساتذہ کے تقرر کے معاملے میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ ریاستی حکومت نے 512 اردو اساتذہ کے تقرر کو منظوری دے دی ہے۔ پہلے مرحلے میں 312 اردو اساتذہ کے تقرر کی منظوری دی گئی تھی، تاہم مزید 200 اسامیوں کے اضافے کے بعد اب یہ تعداد 512 ہوگئی ہے۔ اس پیش رفت سے ریاست کے اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی کمی دور کرنے کی کوششوں کو تقویت ملنے کی امید ہے۔ اس معاملے میں وزیر برائے اقلیتی بہبود، اوقاف و حج یوٹی قادر کی مسلسل کوششوں کے ساتھ قانون ساز کونسل کے چیئرمین سلیم احمد، رکن کونسل بلقیس بانو، ریاستی وزیر برائے شہری رسد و خوراک رضوان ارشد اور دیگر مسلم رہنماؤں کی نمائندگی رہی ہے۔ 800 اردو اساتذہ کے تقرر کے کابینی فیصلے کے پس منظر میں پہلے مرحلے کی 312 اسامیوں میں مزید 200 کا اضافہ اس معاملے میں قابلِ ذکر پیش رفت ہے۔ وزیرِ صحت، اقلیتی بہبود، اوقاف و حج یوٹی قادر نے بتایا کہ 512 اردو اساتذہ کے تقرر سے متعلق سرکاری احکامات اور دیگر ضروری کارروائی کا آغاز عنقریب ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ پہلے مرحلے میں 312 اسامیوں کی منظوری کے بعد مزید اسامیوں کے لیے مسلسل کوشش کی گئی، جس کے نتیجے میں اب 512 اسامیوں کو منظوری ملی ہے۔ ریاست میں تقریباً پندرہ ہزار اساتذہ کے تقرر کے عمل کی تیاری کے وقت ابتدائی طور پر اردو اساتذہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس صورتِ حال پر اردو اساتذہ کے امیدواروں، تعلیمی حلقوں اور مختلف تنظیموں کی جانب سے تشویش کا اظہار کیا گیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کو بھی بھرتی کے عمل میں شامل کیا جائے۔ بعد ازاں ریاست بھر میں احتجاج اور مختلف سطحوں پر نمائندگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلم رہنماؤں نے حکومت اور متعلقہ محکموں کے سامنے اردو اساتذہ کی کمی اور اردو میڈیم اسکولوں کی تعلیمی ضرورت کا معاملہ پیش کیا، جس کے بعد کابینہ نے 800 اردو اساتذہ کے تقرر کو منظوری دی۔ کابینہ میں 800 اسامیوں کی منظوری کے باوجود محکمۂ مالیات کی سطح پر پہلے مرحلے میں 312 اردو اساتذہ کے تقرر کے لیے منظوری دی گئی تھی۔ اس تعداد میں مزید اضافہ کرنے کے لیے یوٹی قادر اور دیگر نے متعلقہ محکموں کے ساتھ رابطے جاری رکھے۔ رکن کونسل بلقیس بانو نے وزیرِ اعلا ڈی کے شیوکمار کے روبرو مضبوط پیروی بھی کی تھی۔ وزیرِ تعلیم مدھو بنگارپا، محکمۂ تعلیم اور محکمۂ مالیات کے اعلا حکام کے ساتھ رابطوں کے ذریعے پہلے مرحلے میں مزید اردو اساتذہ کی شمولیت کا معاملہ آگے بڑھایا گیا۔ اسی دوران قانون ساز کونسل کے چیئرمین سلیم احمد، رکن کونسل بلقیس بانو، ریاستی وزیر برائے شہری رسد و خوراک رضوان ارشد اور دیگر مسلم رہنماؤں نے بھی حکومت کے مختلف متعلقہ حلقوں میں نمائندگی کی۔ واضح رہے کہ اگر باقی 288 اسامیوں کو بھی آئندہ مرحلے میں شامل کرلیا جاتا ہے تو 800 اردو اساتذہ کی مکمل بھرتی کی تجویز عملی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اس لیے موجودہ پیش رفت کے بعد اردو تعلیمی حلقوں کی توجہ اب سرکاری احکامات کے اجرا کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ اسامیوں پر بھی مرکوز رہے گی۔ اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کا معاملہ صرف تقرر کی تعداد تک محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق طلبہ کے تعلیمی مستقبل اور تدریس کے معیار سے بھی ہے۔ اساتذہ کی مناسب تعداد دستیاب ہونے سے موجودہ تدریسی عمل پر پڑنے والا اضافہ بوجھ کم ہوسکتا ہے اور اردو ذریعۂ تعلیم سے وابستہ طلبہ کو بہتر تعلیمی ماحول فراہم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ (سالار۔ بنگلورو)

اس سے قبل معزز مہمان کی محمد تقی نے شال پوشی کی اور لائبریری کی مطبوعات سے صاحبِ اعزاز کو نوازا۔ اس مبارک موقعے پر بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں میں طٰہٰ نسیم، عرفان راہی، انجینئر ظریف احمد، ڈاکٹر امیر حمزہ، محمد تقی کے علاوہ کے اراکین میں سکندر مرزا چنگیزی، تنظیم رضا قریشی، محمد شریف قریشی، حافظ عبدالماجد، ابواللیث، ڈاکٹر عامر رضا اور محمد راشد شریک تھے۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

اردو صحافیوں اور اردو زبان کے ساتھ ناروا سلوک پر استفسار

حیدرآباد (6 اکتوبر)۔ تلنگانہ رکشنا سینا کی چیف کلوا کنٹلہ کویتا نے سرسلہ کا دورہ کیا اور ویملواڑہ راجنا مندر میں خصوصی پوجا کی۔ انھوں نے صحافیوں کو مکانات نہ دینے اور اردو صحافیوں کو ہر منڈل میں صرف ایک ایکریڈیشن کارڈ دینے کی بات پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں اور اردو زبان کے ساتھ یہ رویہ کیوں اختیار کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ویملواڑہ راجنا مندر کی عظیم تاریخی اہمیت ہے۔ کویتا نے کہا کہ ویملواڑہ مندر کو کنکریٹ سے تعمیر کیا جارہا ہے جو طویل مدت تک قائم نہیں رہے گا۔ انھوں نے گلف مزدوروں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب تک 112 مزدوروں کی موت ہوچکی ہے، انھیں فوری طور پر پانچ پانچ لاکھ روپے کی امداد دی جائے۔ جے این ٹی یو کالج میں لیب اور ہاسٹل کی سہولت نہ ہونے، میڈیکل کالج میں ایک کمرے میں 16 طلبہ کے رہنے اور 140 طلبہ کے لیے صرف ایک واٹر فلٹر ہونے پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے مزید ہاسٹل کا مطالبہ کیا اور بنڈی سنجے اور آدمی سرینواس سے میڈیکوز کے مسائل حل کرنے کی اپیل کی۔ کویتا نے کہا کہ ہر فرد کو بہتر اور مفت تعلیم اور طبی سہولتیں فراہمیں کرنا پارٹی کا مقصد ہے اور پنچاجنیم کے پانچ نکات میں تعلیم وصحت کو ترجیح دی گئی ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

مہاراشٹر کے ضلع امراوتی میں 'اردو کیسے سیکھیں' کی رونمائی

امراوتی (11 اکتوبر)۔ 8 اکتوبر 2026 کو الحمدللہ اکھل بھارتیہ اردو شکشک سنگھ، ضلع امراوتی، مہاراشٹر کے اساتذہ کے ضلع اجلاس کے موقع پر معروف مصنف ومعلم محمد عبدالوحید حمیدی کی اہم تعلیمی کتاب 'اردو کیسے سیکھیں' کی رسمِ رونمائی عمل میں آئی۔ اس پُررونق ادبی وعلمی محفل میں ضلع کے مختلف عہدیداران، معزز شخصیات اور اساتذۂ کرام نے شرکت کی۔ شرکا میں مہمانِ خصوصی جناب مظہر علی، ہیڈ ماسٹر حاجی شکور، ہائی اسکول مہمانِ خصوصی وضلع صدر اکھل بھارتیہ اردو شکشک سنگھ جناب محمد عقیل آفتاب، پروفیسر محمد شاکر، سجاد صاحب، محمد ضمیر، تنویر صاحب اور دیگر معزز اساتذہ شامل تھے۔ اس موقع پر مقررین نے کتاب 'اردو کیسے سیکھیں' کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور اسے اردو زبان سیکھنے والوں کے لیے ایک مفید اور کارآمد کتاب قرار دیا۔ انھوں نے اردو زبان کی تعلیم وترویج کے لیے مصنف کی اس علمی وتعلیمی کاوش کو سراہتے ہوئے اس طرح کی کوششوں کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ آخر میں انھوں نے اس کتاب کی رسمِ رونمائی اور ضلع امراوتی کے مختلف اسکولوں میں کتاب 'اردو کیسے سیکھیں' کو متعارف کرانے کے سلسلے میں اکھل بھارتیہ اردو شکشک سنگھ کے ضلع صدر اعلا جناب محمد عقیل کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ ہمیشہ اردو زبان کے فروغ، ترقی اور ترویج کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ دعا ہے کہ آپ کی یہ مخلصانہ کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں اور اردو زبان کی خدمت کا یہ سلسلہ مزید وسعت اختیار کرے۔ (رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو اکیڈمی کی سرگرمیاں صاف، شفاف اور منظّم انداز میں جاری

ممبئی (6 اکتوبر)۔ مہاراشٹر میں اقلیتی برادری سے متعلق مختلف مسائل، بالخصوص حج کمیٹی، مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف وقف، اقلیتی کمیشن اور مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے امور کے سلسلے میں رکن قانون ساز کونسل ادریس نائیکواڑی کی قیادت میں ایک وفد نے ریاستی وزیر اقلیتی امور مادھوری ستیش مساڑ سے ملاقات کی۔ اس موقعے پر اقلیتی برادری کو درپیش مختلف مسائل، تعلیمی امور، طلبہ کی اسکالرشپ، اردو زبان وادب کے فروغ اور متعلقہ اداروں کے کام کاج کے حوالے سے تفصیلی اور سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ وفد میں مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے کارگزار صدر سیّد حسین اختر کے علاوہ ایشور جنواڑے اور سندیپ کواڑے بھی موجود تھے۔ ملاقات کے دوران ادریس نائیکواڑی نے وزیر اقلیتی امور کی توجہ اقلیتی برادری سے وابستہ اہم مسائل کی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا کہ حج کمیٹی، مہاراشٹر اسٹیٹ وقف بورڈ، اقلیتی کمیشن اور مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکیڈمی سمیت مختلف اداروں سے متعلق متعدد امور ایسے ہیں جن کے بروقت حل کی ضرورت ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ اقلیتی برادری کے مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کیا جائے اور متعلقہ محکموں کو ضروری ہدایات جاری کی جائیں تاکہ عوام کو سرکاری سطح پر درپیش دشواریوں سے نجات مل سکے۔ اس موقعے پر مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے کارگزار صدر سیّد حسین اختر نے اکیڈمی کی جانب سے گذشتہ ایک سال کے دوران انجام دی جانے والی مختلف ادبی، ثقافتی اور اردو زبان وادب کے فروغ سے متعلق سرگرمیوں پر مشتمل ایک سالہ کارکردگی رپورٹ بھی وزیر اقلیتی امور مادھوری ستیش مساڑ کو پیش کی۔ اس موقعے پر وفد نے اس امید کا اظہار کیا کہ ریاستی حکومت اقلیتی برادری سے متعلق ان اہم مسائل کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے ان کے حل کے لیے جلد ضروری اقدام کرے گی، جس سے اقلیتی طبقے، طلبہ اور اردو زبان وادب سے وابستہ افراد کو نمایاں فائدہ پہنچے گا۔

انجمن باغ وبہار میں یاد کیے گئے 'پیاز کے چھلے' کے تخلیق کار فکر تونسوی

بھاگلپور (12 اکتوبر)۔ انجمن باغ وبہار، برہ پورہ، بھاگلپور کے زیر اہتمام زبیدہ خاتون کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر ارمان انصاری کی صدارت میں فکر تونسوی کے یومِ پیدائش پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے فکر تونسوی کی حیات وادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فکر تونسوی اردو طنز ومزاح کی تاریخ کا ایک ممتاز ومعتبر نام ہے۔ طنز ومزاح کے میدان میں انھوں نے اپنے قلم کا جادو کچھ ایسے بھرپور طور پر اور اتنے شاندار انداز میں جگایا کہ طنز وظرافت کی دنیا کی عظیم ولافانی شخصیتوں کی صف میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ وہ بیک وقت نامور شاعر، ناول نگار، مضمون نگار، روزنامچہ نگار، رپورتاژ نگار، طنز ومزاح نگار، کالم نگار، ڈراما نگار، مدیر، مزاحیہ خاکہ نگار وغیرہ تھے۔ ان کے طنز ومزاح میں سوز، درد، تڑپ، سماجی شعور، غربت وافلاس، بے انصافی، جبر وظلم، نفرت وعداوت، عیاری ومکاتی، جہالت وتوہم پرستی سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا اصل نام رام لال بھاٹیہ اور ادبی دنیا میں فکر تونسوی، والد کا نام دھنپت رائے اور اہلیہ کا کیلاش وتی ہے۔ وہ 7 اکتوبر 1918 کو شجاع آباد، ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ وفات 12 ستمبر 1987 کو دلّی میں ہوئی۔ تونسہ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا پھر امیر حسن ملتان کالج میں داخلہ لیا۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری میں غزل سے کیا۔ وہ صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔ 1942 میں ان کی نظم 'تنہائی' کے نام سے ادبی دنیا میں شائع ہوئی۔ انھوں نے ممتاز مفتی کے ساتھ مل کر رسالہ 'سویرا' جاری کیا، پھر اس کے بعد وہ رسالہ 'ادبِ لطیف' سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ دن بعد انھوں نے ایک ادبی رسالہ 'رفتار' جاری کیا۔ وہ 1952 میں دہلی آئے اور یہاں انھوں نے قلم کے مزدور کے قلمی نام سے رسالہ 'نیا زمانہ' میں ایک طنزیہ کالم 'آج کی خبر' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ 1955 میں وہ روزنامہ 'ملاپ' سے وابستہ ہوگئے اور 'پیاز کے چھلکے' کے عنوان سے اپنا طنزیہ کالم لکھنا شروع کیا اور آخر تک لکھتے رہے۔ ان کی تصانیف میں ہیولے (شعری مجموعہ)، چمٹا دریا، تیرِ نیم کش، پروفیسر بدھو، ماڈرن الدین، بدنام کتاب، کفن سے کُرتے تک، چھلکے ہی چھلکے، آدھا آدمی، آخری کتاب، فکرنامہ، پیاز کے چھلکے، گھر میں چور، فکر بانی، میری بیوی، ہم ہندستانی، خدوخال، ساتواں شاستر، چوپٹ راجا، وارنٹ گرفتاری، بات میں گھات، راجا راج کرے، اور گمشدہ کی تلاش وغیرہ اہم ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے جن میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ اور غالب ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔

'بشیر، بشر اور قمر' کے عنوان سے عظیم الشان شبِ غزل کا انعقاد

اورنگ آباد (11 اکتوبر)۔ حنا ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اور مطلعِ ادب فاؤنڈیشن کے اشتراک سے ویچسٹر انٹرنیشنل انگلش اسکول کے تعاون سے 'غزل کا سنگار: بشیر، بشر اور قمر' کے عنوان سے ایک ادبی وثقافتی تقریب اور شبِ غزل کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ محفل اردو غزل کے تین ممتاز شعرا بشیر بدر، بشر نواز اور قمر اقبال کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد کی گئی، جس میں اہلِ علم وادب نے اردو غزل کی روایت، اس کے فکری وفنی محاسن اور اس کی تہذیبی اہمیت کو اجاگر کیا۔

تقریب کی صدارت سیّد حسین اختر (چیئرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی) نے کی، جب کہ معزز مہمانان میں کریم سالار، ڈاکٹر دوست محمد خاں، ڈاکٹر شہاب افسر اور ڈاکٹر قاضی نوید شامل تھے۔ پروگرام کا آغاز مہمانوں کے پُرتپاک استقبال، صدرِ محفل کی گل پوشی اور شمع فروزی کی رسم سے ہوا۔ شمع فروزی کی یہ روایت اردو کی علمی وادبی محفلوں کی تہذیبی خوب صورتی اور فروغِ علم کی علامت کے طور پر نمایاں رہی۔ محفل کا بنیادی مقصد اردو غزل کے ان تین معتبر ناموں کو یاد کرنا تھا جنھوں نے اپنے منفرد شعری اسلوب، فکری گہرائی اور تخلیقی انفرادیت سے اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا۔ بشیر بدر، بشر نواز اور قمر اقبال کی شعری خدمات کے اعتراف میں منعقدہ اس تقریب نے سامعین کو اردو غزل کی دلکش روایت سے جوڑنے کے ساتھ نئی نسل میں ادبی ذوق کے فروغ کا پیغام بھی دیا۔ تقریب کے دوران ڈاکٹر دوست محمد خاں نے اپنے طویل شعری سفر کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ انھیں غزل گوئی کا تقریباً چار دہائیوں پر محیط تجربہ حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے 1964 میں پدم شری سکندر علی وجدؔ کی سبک دوشی کے موقعے پر منعقدہ 'شامِ وجد' میں اپنی زندگی کی پہلی غزل پیش کی تھی۔

اس ادبی تقریب کا ایک اہم اور قابلِ ذکر حصہ 'محبِّ اُردو ایوارڈ' کی تقسیم تھا۔ یہ اعزاز ان دس شخصیات کو پیش کیا گیا جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اردو زبان سے اپنی محبت کا عملی ثبوت دیتے ہوئے اس کی خدمت اور ترویج میں اپنا کردار ادا کیا۔ شرکائے محفل نے اسے اردو کے فروغ کے لیے ایک مثبت اور حوصلہ افزا قدم قرار دیا۔ صدارتی خطاب میں سیّد حسین اختر نے اردو غزل کی ادبی اہمیت اور اورنگ آباد کی شعری روایت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اورنگ آباد ہمیشہ سے اردو غزل کے حوالے سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس سرزمین نے ایسے باصلاحیت شعرا پیدا کیے جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف شہر بلکہ اردو زبان کا نام بھی ملک وبیرونِ ملک میں روشن کیا۔ ڈاکٹر دوست محمد خاں نے اپنی آواز میں منتخب غزلیں پیش کرکے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کی مترنم آواز اور دل نشیں اندازِ پیشکش نے محفل کو ایک خاص کیفیت عطا کی۔ افتتاحی نشست کے اختتام پر ڈاکٹر قاضی نوید نے اظہارِ تشکر کیا اور منتظمین، مہمانانِ گرامی اور شرکائے محفل کی آمد وتعاون پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کا اختتام ایک دلکش اور مسحور کن شبِ غزل پر ہوا، جس کی نظامت ڈاکٹر دوست محمد خاں اور کویتا وٹنی نے انجام دی۔ غزلوں کی مترنم پیشکش شعری احساسات کی رنگارنگی اور اردو زبان کی شیرینی نے محفل کو یادگار بنادیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **مجلّہ الزبیر اور اقبال شناسی کی روایت**
مرتبہ : ڈاکٹر شاہد حسن رضوی
قیمت : 1000 روپے
ناشر : اردو اکیڈمی، بہاول پور
مبصر : پروفیسر شاہد کمال

E-mail: shhdkamal@yahoo.com.

اردو دنیا میں ہمیشہ سے کسی ادبی جریدے کی اشاعت اور اُس کا مستقل تسلسل خونِ جگر کی آمیزش کے بغیر ممکن نہیں۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے، لیکن ہر عہد میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اندر آثارِ جنوں تلاش کر کے لوگوں کو دیوانہ بنائے رکھتے ہیں، اور یوں کوئی ادبی جریدہ اگر برسوں بلاتعطل اشاعت پذیری کی شاہراہ پر تیز تیز قدم بڑھاتا دکھائی دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اسے لکھنے والوں اور قارئین دونوں ہی کی قبولیت حاصل ہے، جس کا کریڈٹ بہرحال اُس جریدے کی مجلس ادارت اور اُس شخص کو جاتا ہے جس کے فانوسِ خیال کی جلوہ آرائیِ ادب نے کسی ایسے اشاعتی پلیٹ فارم کو جگمگایا جس پر بہت سے لکھنے والوں کے قلم کی سیاہی نور بکھیرتی ہوئی نظر آئی۔ ایسا ہی ایک فقیدالمثال ادبی جریدہ سہ ماہی 'الزبیر' بھی ہے جس کی بلاتعطل اشاعت کا زمانہ نصف صدی پر محیط ہے۔ ممتاز محقق اور سوانح نگار مسعود حسین شہاب دہلوی کے ہاتھوں لگایا ہوا یہ پودا آج اس قدر گھنیرا ہو چکا ہے جس کی ہر شاخ پر ادب کے خوشہ چیں کلکاریاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طویل عرصے میں 'الزبیر' نے بے شمار لکھنے والوں کو نہ صرف طباعت سے آشنا کیا بلکہ اُن کی تخلیقات کو کمالِ خوبی سے اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے۔ اس کے اشاعتی سرمایے میں متعدد موضوعات ایسے ہیں جو اپنی ایک انفرادی شان رکھتے ہیں، خاص طور پر 'ادبی معرکہ نمبر'، 'کتب خانہ نمبر'، 'آپ بیتی نمبر' اور غالب و اقبال وغیرہ سے متعلق نایاب مباحث و مضامین شامل ہیں۔ سردست الزبیر کا ایک بے مثل کارنامہ 'اقبال شناسی کی روایت' ہمارے زیرِ گفتگو ہے۔ یوں تو یہ علاحدہ سے ایک کتاب ہے جسے بہاول پور اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ لیکن 'الزبیر' بہاول پور اکیڈمی اور اقبال شناسی کی روایت آپس میں اس لیے مدغم ہیں کہ 'الزبیر اور اقبال شناسی' کی طابع اور ناشر بہاول پور اکیڈمی ہے اور اقبال شناسی کی روایت میں شامل 65 مضامین وہ ہیں جو سہ ماہی 'الزبیر' میں شائع ہوئے۔

بہاول پور اکیڈمی کے روح رواں اور مدیر 'الزبیر' ڈاکٹر شاہد حسن رضوی کی مستقل مزاجی قابلِ داد ہے جس نے اس وقیع کتاب کی اشاعت کو ممکن بنایا اور اقبال شناسوں اور ادب و تحقیق کے طالب علموں کے لیے اقبال سے متعلق تنقید و تحقیق کا ایک عمدہ مجموعہ پیش کیا۔ ہماری تنقیدی روایت میں کسی شخصیت پر گفتگو کے موضوعات کو یک جا کرنے کا نام شناسی رکھا گیا ہے، جس کا آغاز غالباً غالب شناسی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سرسید شناسی، اقبال شناسی، فیض شناسی، جوش شناسی، ندیم شناسی اور ادبیات شناسی وغیرہ ہمارے تنقیدی سرمایے کا حصہ ہیں۔ یہ مضامین اپنے موضوعات میں کہیں کہیں بہت ہی منفرد عنوانات کے حامل ہیں۔ مثلاً نذیر مومن کا مضمون 'اقبال کی شاعری کا نفسیاتی پس منظر'، شہاب دہلوی کا 'علامہ اقبال اور بہاول پور'، ڈاکٹر سلیم اختر کا 'اقبال کا تنقیدی شعور'، طاہرہ ناز کا 'علامہ اقبال کا سفر مدراس اور اُس کی تفصیلات' میاں مشتاق کا 'اقبال اور فرید'، ڈاکٹر ریاض احمد شاہد کا 'بابا طاہر عریاں اور اقبال' اور عبدالستار نیازی کا مضمون 'بہاول پور میں اقبال شناسی'۔ ایسے مضامین ہیں جو اپنے موضوعات کی جدت اور انفرادیت سے پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ جب کہ دیگر مضامین وہی ہیں جو اقبال سے متعلق نصابی سطح پر گردان کے باعث عوام الناس میں مشہور ہیں۔ مثلاً 'صاحبِ بانگ درا'، 'اقبال کا فلسفہ خودی'، 'شاہین اقبال کی نظر میں'، 'مولانا روم اور اقبال' اور اس طرح کے دوسرے مضامین۔ یہ وہ تحریریں ہیں جن کی وجہ اقبال شناسی نہیں بلکہ اقبال شناسی کی وجہ سے اب یہ مضامین جانے جاتے ہیں۔

لیکن اس سے اس کتاب کی صحت کسی بھی طرح متاثر نہیں ہوتی کیوں کہ یہی وہ موضوعات ہیں جو ہمارے ہاں اقبال کے تعارف کا لازمہ سمجھے جاتے ہیں۔ فی زمانہ اقبال شناسی کی روایت میں 'الزبیر' کے مضامین نے جو اضافہ کیا ہے اہلِ ادب و تحقیق کے لیے یہ 'برگِ سبز است تحفۂ درویش' کی روایت کا تسلسل ثابت ہوا ہے۔ ◆◆

شبلی کی تحریکی حسیت اور اس کے اسباب و محرکات

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

''انگریزی ترجمہ قرآن کی تجویز قریب قریب پوری ہو چکی تھی، نواب عمادالملک بلگرامی نے جو اپنے زمانے کے بے نظیر انگریزی انشاپرداز تھے، مولانا (شبلی) کی تحریک سے پندرہ پاروں تک ترجمہ کر چکے تھے، جو مطبوعہ مسودے کی صورت میں اب تک موجود ہے، پھر مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم جب دارالعلوم حیدرآباد پرنسپل ہو کر گئے تو نواب صاحب نے ان کے مشورہ و استصواب سے اپنے ترجمے کے کئی پاروں پر نظر (ثانی) کی۔

نواب صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے یہ مسودہ نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر، وزیر سیاسیات و تعلیمات سرکار نظام سے منگوا بھیجا تو اس نظر ثانی شدہ مسودے کا پتا نہ چلا، جس کا بہت افسوس ہے۔''

(مقالات شبلی جلد 8، ص:9)

بعد میں دبستانِ شبلی کے ایک اور صاحبِ علم و دین و دانش مولانا عبدالماجد دریابادی (1977-1892) نے قرآن پاک کی انگریزی میں تفسیر لکھ کر ایک تاریخ رقم کی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں صاحب نے بھی دبستان شبلی کی اس کمی کی تلافی اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ مع تعلیقات و حواشی لکھ کر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

بشیر بدر کے لہجے کی انفرادیت

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

خدائے سخن بنا دیا تھا اور اپنی شاعری کو بھاری بھرکم تراکیب اور غیر شاعرانہ اصطلاحات سے محفوظ رکھا بالخصوص ایسے اشعار کہہ کر:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے
جس شاخ پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

قدیم قصبوں میں کتنا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا دریا نہیں رہتا

اور چوتھائی صدی کا عرصہ گزر گیا لیکن بشیر بدر کی مقبولیت و شہرت کا آفتاب نصف النہار پر رہا اور وہ عوام کی اکثریت کے چہیتے شاعر بنے رہے۔ مشاعروں کو جہاں اُنھوں نے مقبول بنایا وہیں مشاعروں کا اُن پر احسان ہے، عام انسانوں کے دلوں میں انھیں زندہ رکھا، اُن کے بہت سے معیاری اشعار مشاعروں کے ذریعے ہی ہم تک پہنچے ہیں، جنھیں آج غالباً معاصرین میں سب سے زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

20-گھاٹی بھڑبھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ

بشیر بدر

- بشیر بدر برِّصغیر ہند و پاک ہی نہیں، عالمی سطح پر مشاعروں کی دنیا کی ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شاعری نے مشاعروں میں شرکت کرنے والے ان کے ساتھی شعرا کے ساتھ مشاعروں کی بنیادوں کو بھی زیر و زبر کر دیا تھا۔ وہ تقریباً نصف صدی تک اردو غزل کے بانکپن سے سرشار گیسوے غزل کو سنوارتے رہے۔ بلاشبہ ان کا عہد مشاعروں کا ایک زرّیں عہد رہا ہے۔ بشیر بدر نے نثر میں بھی اپنی تحقیقی و تنقیدی عظمتوں کے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلے 1981 میں طبع ہوئی تھی، اس کا دوسرا اڈیشن 2023 میں نہایت خوب صورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔
- انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ہر عہد کی ایسی ہی شخصیتوں کی نادر تحقیقی و تنقیدی تحریروں کو اردو ادب کے عام قاری تک اپنے نفیس اور پُرکشش انداز میں پہنچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہی ہے۔ بشیر بدر کی کتاب 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم اور مفید کتاب ہے جس کی ایک دستاویزی حیثیت ہو گئی ہے۔
- بشیر بدر کی یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ ساتھ منفرد موضوعات کا مطالعہ کرنے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام قاری کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے۔

ضخامت: 343 صفحات ـــــ قیمت: 500 روپے

تصوف، صحافت، سیاست، مردِ حُر اور رئیس المتغزلین: حسرت موہانی

(بقیہ صفحہ ایک سے آگے)

حسرت داخلیت کو بنیادی عنصر سمجھتے ہیں، اسی لیے اپنی فکری آزادی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ ان کے اشعار میں قلبی واردات کا غلبہ ہے۔ یوں بھی نہیں کہ وہ عشق کی لطافتوں سے گریز کرتے ہوں عشق کی مختلف کیفیات ملاحظہ کیجیے:

ہم جب سے ہوئے ہیں کافرِ عشق
تسبیح بکار ہے نہ زُنار[12]

مذہبِ عشاق ہے بیگانۂ قیدِ رسوم
ہاں نہیں حسرت بکھیڑا سبحہ و زُنار کا[13]

اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام[14]

حسرت کی غزل گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالواجد تبسم لکھتے ہیں؛

'حسرت کی غزل ہندستان کی فضا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے، جس میں مہندی، پان اور پھولوں میں موتیا، بیلا، چنبیلی اور نازبو، کھیلوں میں گنجفہ، تعویز، گنڈا اور مزار پر حاضری کا ذکر ہندستان کے تہذیبی مظاہر کا حصہ ہیں۔ اس طرح ان کے کلیات میں موجود ایک غزل جو 'سہرا' کی ردیف میں ہے، یہ بات ثابت کرتی ہے کہ ان کی غزل کا ہندستان کی سرزمین سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ ہندی تہذیب و معاشرت کے حوالے سے ان کے ہاں کرشن کا ذکر بطور خاص ملتا ہے، جس کے نام کے ساتھ انھوں نے ہر جگہ 'علیہ رحمت' لکھا ہے۔'[15]

حسرت کی ہندستان کی تہذیب و تمدن سے پختہ وابستگی اور برملا اس اظہار کے بارے میں ڈاکٹر سعداللہ کلیم لکھتے ہیں؛

'حسرت کے مسلکِ تصوف اور بے تعصبی کو عمومی ہند اسلامی تہذیبی چلن سے زیادہ اور کرشن کے ساتھ خصوصی عقیدت کی حد تک شمار کر سکتے ہیں۔'[16]

کرشن کے لیے انھوں نے 'حُسن مُشک فام' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں کرشن کی بانسری کے ہر نغمے کو حیاتِ جاوداں قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں ہندوؤں کے مقدس مقامات کا ذکر بھی موجود ہے:

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیم عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص[17]

حسرت کی غزلوں میں جا بجا نظمیہ رنگ سے روانی اور نغمگی مائل بہ جمود پذیر لگتی ہے۔ اس فنی پہلو کے بارے میں نقد کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی رقمطراز ہیں:

'حسرت کی غزلیں نظم یا 'غزل نما نظم' ہیں۔ ضبط اور ٹھراؤ کی بجائے جذبات میں ہیجانی کیفیت غزل کے لیے بڑی تباہ کن ہے۔ یہ کیفیت شاعر سے رومانی نظم تو کہلوا سکتی ہے لیکن غزل نہیں۔ حسرت اس ہیجانی کیفیت پر قابو نہیں پا سکے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ مجھے ان کی 'نظمیت' کھٹکتی رہی ہے...اس لیے ان غزلوں پر اگر کوئی عنوان رکھ دیں تو یہ آسانی سے نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔'[18]

حسرت کے کلام میں ہمیں ہندی گیت، ٹھمریاں اور ہولیاں بھی ملتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالواجد تبسم نے لکھا ہے:

'اظہارِ محبت عورت سے مرد کی طرف ہے جو ہندی روایت کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ زبان، بحر اور بندش بھی ہندی گیتوں اور ٹھمریوں کی ہے۔ بحیثیت مجموعی حسرت کے گیتوں، ٹھمریوں اور ہولیوں کے موضوعات اور ہیئت دونوں پر ہندی روایات کا نہایت گہرا اثر ہے۔'[19]

ملاحظہ کیجیے:

برہ کی رین کٹے نہ پہاڑ
سونی نگریا پڑی ہے اجاڑ[20]

نیہ کی آگ ماں تن من مارے
کب لگ جلت رہی چپ چاپ[21]

ان اشعار میں برہ کی آگ بھی ہے اور محبوب کی جدائی میں جوگی بننے کا ذکر بھی، حسرت کے ایسے اشعار میں کرشن بھگت فلسفہ کا رنگ نمایاں ہے۔

حسرت مزاجاً حسن پرست، عملاً ایک صوفی اور حریت پسند تھے۔ انھوں نے اپنی فکری اور عملی آزادی کی روح کو قاری میں پروان چڑھایا۔ وہ یاد دلاتے رہے کہ ہندستان کی دولت و حکومت پر انگریز قابض ہے۔ یہی وہ فکر تھی جس سے غیر ملکی حاکم خوفزدہ اور غزل کے اسی علامتی اسلوب کی قوتِ ابلاغ سے وہ فکرمند تھے اور اسی کو ختم کرنا چاہتے تھے مگر بے بس رہے۔ اس زاویے سے ہندستان کی تمام ترقی پسند تحریک حسرت کی مقلد نظر آتی ہے، خاص طور پر فیض و مجاز ان کے سچے جانشین ٹھہرتے ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں 1895 میں شعر کہنے والے حسرت نے مجموعی طور پر تقریباً سات ہزار شعر کہے جن میں سات سو اکہتر غزلیں ہیں جن میں سے تین سو تہتر انھوں نے قید فرنگ کے دوران ضبطِ قلم کیں۔ انھوں نے آخری غزل اپنے انتقال سے تقریباً پانچ ماہ قبل 2 دسمبر 1950 کو لکھی تھی۔

اس مردِ حُر نے 1921 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں کامل آزادی کی قرارداد پیش کی کہ ہندستان کو مکمل آزادی دی جائے اور انگریز ہندوستان خالی کر دے۔ 1936 میں مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے ہندستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھے۔ اپنی حق گوئی اور حریت پسند اظہاریہ کے نتیجے میں انھوں نے اپنی زندگی کے سولہ برس فرنگی کی جیل میں صعوبتیں برداشت کرتے بسر کیے۔ آزادی کے بعد انھوں نے پاکستان ہجرت نہیں کی اور نہ پاکستان کو کبھی برا کہا۔

13 مئی 1951 کو ان کا وصال ہوا اور لکھنؤ میں باغ مولانا انوار کے ایک گوشے میں تہہ خاک وہ ابدی نیند سوتے ہیں۔ حسرت کی شخصیت مستقبل میں بھی ہندو پاک کے شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کے رچاو، بساو اور پھیلاو میں قابلِ تقلید رہے گی۔

حواشی

۱ پروفیسر محمد رئیس علوی، اردو معاشرے میں غزل کی مقبولیت کے کم دیدہ اور نادیدہ جواہر اور صفات، داستان پبلشرز، پاکستان، 2022، ص148۔
۲ ایضاً، ص150۔
۳ ایضاً، ص150۔
۴ ایضاً، ص149۔
۵ ایضاً، ص151۔
۶ ایضاً، ص148۔
۷ پروفیسر رشید احمد صدیقی، کچھ حسرت کے بارے میں، مشمولہ، ماہنامہ نگار، (حسرت نمبر) دہلی، 1952، ص68۔
۸ مولانا حسرت موہانی، کلیاتِ حسرت موہانی، حیدرآباد دکن، انتظامی پریس، 1943، ص7۔
۹ ایضاً، ص81۔
۱۰ ڈاکٹر یوسف حسین خان، حسرت کی شاعری، آئینہ ادب، لاہور، 1964، ص68۔
۱۱ کلیاتِ حسرت موہانی، ص27۔
۱۲ کلیاتِ حسرت، خزینۂ علم و ادب لاہور، 2004، ص572۔
۱۳ ایضاً، ص750۔
۱۴ ایضاً، ص138۔
۱۵ ڈاکٹر عبدالواجد تبسم، اردو غزل میں ہندی عناصر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2017، ص141۔
۱۶ ڈاکٹر سعداللہ کلیم، اردو غزل کی تہذیبی اور فکری بنیادیں، جلد دوم، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 2005، ص985۔
۱۷ کلیاتِ حسرت موہانی، خزینۂ علم و ادب، لاہور، ص578۔
۱۸ خلیل الرحمٰن اعظمی، فکر و فن، آزاد کتاب گھر، دہلی، 1954، ص 98-99۔
۱۹ اردو غزل میں ہندی عناصر، ص142۔
۲۰ کلیاتِ حسرت موہانی، حیدرآباد دکن، انتظامی پریس، ص613۔
۲۱ ایضاً، ص602۔

سابق صدر شعبۂ اردو، سراج الدولہ گورنمنٹ
ڈگری کالج نمبر ا، کراچی-0333 2125510
E-mail: urduduniya92@gmail.com

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

محرابِ تمنا
فطرت انصاری
قیمت: 200 روپے

اُردو زبان و ادب کا پہلا محقق و مدرس
جان بارتھ وِک گل کرسٹ
تالیف و ترجمہ
صدیق الرحمٰن قدوائی
قیمت: 250 روپے

بشیر بدرؔ کے لہجے کی انفرادیت

عارف عزیز

راقم نصف صدی سے ڈاکٹر بشیر بدرؔ کی شاعری کا مطالعہ کر رہا ہے اور اُن کے کلام کی خوبیوں کا معترف ہے، پینتالیس برس قبل 1981 میں جدید اُردو شعرا کے ایک ریڈیائی مشاعرہ میں شرکت کے لیے پہلی بار بشیر بدرؔ اقبال مجید صاحب کی دعوت پر بھوپال آئے تھے، تب میں نے اُنھیں سیفیہ کالج شعبۂ اُردو کے ایک پروگرام میں دیکھا اور سنا تھا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے حکم پر عبدالمتین نیازؔ کے تازہ مجموعۂ کلام 'حرف وصدا' کے جائزہ پر ایک مضمون بھی پڑھا تھا، بھوپال میں تیسرا مشاعرہ جس میں بشیر بدرؔ نے اُس وقت شرکت کی، وہ اجاریہ نریندر دیو لائبریری کے ہال میں اُردو اکادمی کے نئے سکریٹری فضل تابش نے کرایا تھا، جو فضلؔ صاحب کی سکریٹری شپ کا پہلا پروگرام تھا۔ سیفیہ کالج میں بشیر بدرؔ نے پے در پے اپنی پرانی و نئی غزلیں سنا کر سامعین پر سحر طاری کر دیا تھا، بالخصوص عزیز قیسی اور اُنھوں نے کئی ہم وزن و ہم قافیہ غزلیات سے محفل کو گرما دیا تھا۔ اُن کے کلام اور ترنم نے مجھے بھی بہت متاثر کیا۔ ایک سال بعد دین دیال وچار پرکاشن نے اپنے ہفت روزہ 'ایاز' کی دس سالہ تقریبات کا اہتمام کیا تو اُس کے انڈو پاک مشاعرے کے شعرا کی فہرست میں بشیر بدرؔ کا نام بھی شامل تھا۔ 'ایاز' تقریبات کمیٹی کا میں خازن تھا اور اُس کے انتظام و انصرام میں شریک رہنے کے باعث دو دن بشیر بدرؔ، قتیل شفائی اور دوسرے ڈیڑھ درجن شعرا کی میزبانی کرتا رہا تھا، جس میں پاکستان کے دو اور نمائندہ شعرا بھوپال نژاد افسوںؔ بھوپالی اور مجیب خیرآبادی شامل تھے۔ مشاعرے کی نظامت بشیر بدرؔ نے اور صدارت سابق وزیرِ خارجہ آنجہانی اٹل بہاری واجپئی نے کی تھی۔

بشیر بدرؔ سے یہ ابتدائی تعارف اُس وقت مزید گہرا ہو گیا، جب وہ 1988 میں بھوپال کے داماد بن کر یہاں آئے اور اکثر روزنامہ 'ندیم' کے آفس میں اپنی بیگم محترمہ راحت بدر کے ہمراہ آجاتے اور ادبی مسائل و موضوعات پر اقبال مسعود اور راقم کے ساتھ اُن کی گفتگو ہوتی رہتی۔ ایک صبح بدرؔ صاحب 'ندیم' آئے تو میرا تازہ کالم جو بدنام زمانہ سلمان رُشدی کے ناول 'شیطانی آیات' (The Satanic Verses) کی برطانیہ میں اشاعت پر پابندی کی حمایت میں تھا اُس کی تائید کرنے لگے، وہ ناول کے اِس پہلو سے کافی دلبرداشتہ تھے کہ اُس کے ذریعے ملعون مصنف نے رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ والا صفات کو نشانہ بنانے کی نعوذ باللہ جرأت کی۔ مجھے یاد ہے کہ اُنھوں نے ہندستان میں اِس پر پابندی لگانے کی تائید کی تھی، جس کا جلد اعلان ہو گیا تو اِس مطالبے کے پورا ہونے پر بہت خوش نظر آئے۔

جس زمانے میں بشیر بدر مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کے چیئرمین تھے، اکادمی نے مرزا غالبؔ کے یومِ وفات پر ایک سیمینار منعقد کیا، اِس میں ڈاکٹر بشیر بدرؔ، راقم عارف عزیز، محمد ادریس مونس نے حصّہ لیا تھا؛ بشیر بدرؔ نے غالبؔ کے ضرب المثل اشعار پر تفصیل سے روشنی ڈال کر سو سوا سو سال کے دوران ہماری سماجی زندگی پر غالبؔ کے اشعار نے جو گہرے اثرات مرتب کیے اُس پر گفتگو کی تھی۔ اِس سے قبل بشیر بدرؔ نے ایک تفصیلی انٹرویو بھی مجھے دیا تھا، جو 'ندیم' کے سنڈے ایڈیشن میں حبیب احمد نے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ اِس انٹرویو میں اُردو زبان و ادب کے مسائل کے ساتھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اُنھوں نے کافی معلومات فراہم کی تھی، بالخصوص میرٹھ کے فرقہ وارانہ فساد پر، جس میں اُن کی زندگی کا سارا قیمتی اثاثہ تباہ ہو گیا تھا، اُس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

ڈاکٹر بشیر بدر کے بارے میں ایسے ہی متعدد واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن اُن کے ذکر کے بجائے میں بدرؔ صاحب کی شاعری پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فی الوقت اُن کے اشعار کی ندرت و خصوصیات میرے پیشِ نظر ہیں، جہاں تک بحیثیت شاعر بشیر بدرؔ کے مقام کا تعلق ہے تو بلاشبہ اُردو غزل کے وہ منفرد و مقبول شاعر ہیں، جن کے ذکر کے بغیر آزادی کے بعد غزل کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ وہ برسوں بسترِ علالت پر نیم بے ہوشی کی حالت میں دراز رہے تاہم اُن کے اشعار اُردو دنیا میں گونجتے رہے اور ایک جہان اُن کو گنگناتا رہا، جس میں غیر اُردو داں پرستاروں کی بڑی تعداد شامل تھی جو مشاعروں میں اُنھیں دیکھنے اور سننے کے لیے ساری رات اپنی نشستوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کے کلام کی سادگی اور ترنم کی نغمگی نے ہر کس و ناکس کو اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ دوسری طرف ادبی رسائل نے اُن کی شہرت کو یوروپ و امریکہ تک پہنچا دیا اور خلیجی ریاستوں میں تو اُن کی بے مثال پذیرائی ہوئی۔

بشیر بدرؔ نے جدید غزل کے نمائندہ شعرا میں اپنی زبان، بیان، لفظیات، استعارات اور پیکر تراشی کے ذریعے عصری زندگی کے جن مسائل کو اشعار کا جامہ پہنایا، غزل کے لب و لہجے کو انفرادیت سے ہمکنار کیا، اُس میں یگانہؔ ہوں، فراقؔ ہوں، ناصرؔ کاظمی ہوں سب کے وہ ہمسر نظر آتے ہیں، ذرا اِن اشعار کی تب و تاب ملاحظہ ہو:

سر سے چادر، بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری
اوپر اوپر ہنستے رہنا، گہرائی میں رو لینا

حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدرؔ کے اشعار پڑھ کر جہاں بہتے پانی کی روانی اور گہری سادگی کا لطف آتا ہے، وہیں اُن کا اُسلوب و ادا روایتی ہونے کے باوجود تازہ کاری کا احساس دلاتا ہے۔ صرف دو شعر اِس کی تصدیق کے لیے کافی ہیں:

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو
وہ عطردان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اُردو زبان کی خوشبو

بشیر بدرؔ نے اپنے بارے میں کئی تعلّی آمیز دعوے کیے ہیں، لیکن ایک شعر میں اُن کا اپنے تئیں دعویٰ مبنی بر حقیقت نظر آتا ہے کہ اُن سے پہلے جدید غزل محض خواب تھی، جس کو اُنھوں نے نیا لہجہ دیا، جو نیا نیا بھی تھا اور پہلے سے کہا ہوا، سنا ہوا بھی نہ تھا:

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے رِبن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا، نہ کہا ہوا، نہ سنا ہوا

سچائی یہ ہے کہ بشیر بدرؔ اپنے ڈکشن کی وجہ سے نہیں، لہجے کی انفرادیت کے باعث یاد رکھے جائیں گے۔ ہر بڑا شاعر اپنے لہجے کی اِسی خوبی کی وجہ سے زندہ رہتا ہے۔ اُس کا اپنا اُسلوب جس میں وہ اشعار کہہ رہا ہے تو اُس کی آواز کبھی خلاؤں میں گم نہیں ہوتی، حالاں کہ بشیر بدرؔ صرف شاعر تھے اور شاعری کرتے تھے مفکری نہیں۔ اُنھوں نے دانستہ میر تقی میرؔ کے اُس لہجے کو اپنایا جس نے میرؔ کو ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***